Rooh-e-Tahqeeq, Vol.03, No.02, Serial No. 08, April-June 2025

تعلیماتِ تصوف کی بنیادی کلید اور جگرِ لخت لخت (آپ بیتی) میں صوفیانہ رنگ

The Fundamental key to the teachings of Sufism and the mystical style of Jagar-e-Lakht-Lakht (Autobiography)

Ghulam Hassan Fareed
PhD Research Scholar (Urdu), Federal Urdu University, Islamabad
hassanfareed073@gmail.com

Dr. Zeenat Afshan
Assistant Professor of Urdu, Federal Urdu University, Islamabad
zeenatafshan6@gmail.com

Abstract:
Spirituality is an integral part of our life. Spirituality is a separate place from our material world. From the Islamic point of view, Sufism is the path to the satisfaction of spirituality. Good morals are the guiding light for humanity and these good morals are the key to the path of Sufism. The Work of a Dervish is to the share and spread love among humans. He brings society towards the path of God with love. Urdu language and literature evolved with the Islamic teachings and practices of the most revered Sufies. Our forefathers did the work of reforming the Indian society through Sufism. These Sufies casted a great influence on the culture of the sub-continent. The autobiography of our forefathers are the adornment of Urdu literature. In this regard, the Sufi's style of "Jagar-e-Lakht Lakht" (Autobiography) is highlighted.

Keywords:
Taqlid Pasand, Warta-e-herat, Sahib-e-basirat, Mubtadi, Lala-o-gulfam, Naznin, Tahniyat, Shesha gari, Baqa-e-dawam, Tatbo, Amor-e-Mahsosa, Amor-e-Bataniya, Qalid, Inhamaq

انسان تقلید پسند واقع ہوا ہے۔ وہ افعال و کردار میں تقلید کو طرزِ عمل بنا کر زندگی کے شب و روز گزار رہا ہے۔ بنی نوع انسان کو خدائے لم یزل نے یہ بصیرت اور دانائی بخشی ہے کہ وہ نت نئی ایجادات کر کے دنیا کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر رہا ہے مگر اس تخلیق کے لیے کوئی نا کوئی محرک، سوچ، خیال، نظریہ تو ضرور ہو گا یا کوئی ایسی صاحبِ بصیرت چیز موجود ہو گی جسے دیکھ کر یا سوچ کر انسان نئے نئے آئیڈیاز کو عمل میں لا رہا ہے۔ انسانی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ مبتدی بشر نے اپنی زندگی کے درپیش مسائل کے حل ان تمام مخلوقات یا جانداروں سے سیکھے جو اس سے پہلے دنیا میں موجود تھے۔

صبح و شام کے جلوؤں کی رعنائیاں، سورج اور چاند کی تمازت و ٹھنڈک، طوفان و بادوباراں میں وحشت و رحمت، فطرت کے حسن کی دلکشی، لالہ و گلفام کی رنگ و خوشبو، حسینوں کے حُسن کی جھلک اور نازنینوں کے چہروں کی دمک کے پیچھے کوئی راز تو ہے۔ موسیقی کی دھنوں اور ترنم کی کھنک میں کس کی آواز گونج رہی ہے؟ ان مظاہر کا عرفان کرنے میں انسان الگ الگ صورتوں میں کوشش کرتا رہتا ہے۔ خالقِ حقیقی اپنی ہستی کا ادراک کارخانہ دنیا میں مختلف انداز سے کرتا رہتا ہے، کبھی وہ اپنے بندوں پر اپنے جلوؤں کو عیاں کرتا ہے اور کبھی نہاں خانوں سے دلوں میں القا کرتا ہے۔ حُسن و عشق کا سلسلہ روزِ ازل سے دست بہ دست ہے۔ جہاں حُسن کی جلوہ گری ہے وہاں عشق لازم ہے۔ انسانی وجود کا ظہور بیداری عشق اور فنا سرِ مستی عشق ہے۔ عشق کی انتہا ایسے معشوق کا دیدار ہے جو بعینہٖ اپنا پرتو اپنے چاہنے والوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ خود

رحیم ہے اس لیے اسے رحم کرنے والے پسند ہیں۔ وہ خود محسن ہے اس لیے اسے احسان کرنے والے محبوب ہیں۔ وہ جمیل ہے اس لیے جمال دوستوں کو وہ اپنا دوست رکھتا ہے۔ اس کا مسکن و محور ایسے قلوب ہیں جو منزہ و پاک و صاف وطہنیت کے حامل و مرکوز ہیں۔

وہ اپنے دیدار کی لگن جس کو لگا دیتا ہے وہ بے خود ہو جاتا ہے۔ اس کی تجلی کے ظہور کو پانے کے لیے جس راستے کا انتخاب کیا جاتا ہے وہ راستہ تصوف کہلاتا ہے۔ منہاجِ تصوف سہل نہیں بلکہ خار دار وادیوں سے ہو کر گزرنے والا وہ راستہ ہے جس کی راہ میں سالک اپنے افعال و اعمال کو ذاتِ حقیقی کے تصرف میں کھپا دیتا ہے اور فنا ہو کر منزلِ مقصود حاصل کرتا ہے۔ اس راہ پر راہی کے قدم لہولہان ہو جاتے ہیں، جسم زخموں سے چھلنی ہو جاتا ہے، آنکھوں سے دیدارِ الٰہی کے لیے چشمہ خوں جاری ہو جاتا ہے پھر کہیں جا کر منزل تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایسی کارگہ ہے جسے شیشہ گری کی صنعت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یہاں آرام و سکون کی گنجائش نہیں۔ اس منزل کا دستور نرالا ہے یہاں جو جسم و جاں کو بچانے کی کوشش کرتا ہے وہ فنا ہو جاتا ہے اور جو جسم و جاں کو خالقِ حقیقی پر قربان کر دیتا ہے وہ بامراد ٹھہرتا اور بقائے دوام حاصل کر لیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جب محبوب اور محب میں دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ حدیثِ قدسی ہے:

> ”اللہ پاک فرماتا ہے کہ اے میرے بندے! تیرے حق کی قسم! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور میں تجھے اپنے حق کی قسم دیتا ہوں کہ تو میرا محب ہو جا۔“(۱)

تصوف درحقیقت اپنی رضا کو رضائے الٰہی کے تابع کرنے اور خود کو خدائی مشیعت کے سپرد کر دینے کا نام ہے۔ تصوف کے بارے میں اہل الرائے کی مختلف آرا ہیں۔ کوئی ایک رائے کو پسند کرتا ہے اور تو کوئی دوسری کو۔ البتہ تمام صوفیا اس بات پر متفق ہیں کہ روح کی پاکیزگی اور دل کی صفائی کے بغیر حقیقتِ اعلیٰ کے جلووں کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ صوفی ازم درحقیقت اسلام کی روحانی شاخ کا نام ہے جو دل کی صفائی اور روح کی پاکیزگی کے ساتھ قربتِ الٰہیہ پر زور دیتی ہے۔ اس پاکیزگی کو حاصل کرنے کے لیے اس دنیا میں آنے والے ہر راہبر نے مخصوص عبادات، افعال، اعمال، گیان، توبہ و استغفار کے طریقے بتائے ہیں۔ اس حوالے سے سب سے مقدم اور بہترین طریقہ اسلام نے متعارف کروایا ہے۔ اسلام ایسا دین ہے جس میں نا صرف تعلیمات کا درس ملتا ہے بلکہ عمل کرنے کے لیے احکامات اور خود عمل کی مثالیں بھی سامنے نظر آتی ہیں۔ اسلام نے شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کا جو راستہ وضع کیا ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ تصوف طریقت کا باطنی پہلو ہے۔ تصوف مذہب سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ روحِ مذہب ہے۔ رسالہ قشیریہ میں امام القشیری لکھتے ہیں:

> ”تصوف یہ ہے کہ حق تجھے تیرے وجود سے فنا کر کے اپنے ذریعہ سے بقاعطا فرمادے۔“(۲)

تصوف اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، یہ ہر مذہب و ملت میں مخصوص افراد کا طرزِ عمل رہا ہے۔ ہاں ایسا ضرور ہے کہ اسلام نے تصوف یا روحانیت کی اصل کو اپنے صحیح معنوں میں منکشف کرنے کی سعی کی ہے۔ صوفی ازم کے دو طریقے زیادہ رائج ہیں: ایک طریقہ اسلام میں اور دوسرا ہندوازم میں مشہور ہے۔ پہلا صوف پوشی ہے جس میں صوفی اپنے لباس کے ذریعے اپنی پہچان کرواتا ہے دوسرا علم بیدانت جس کو ہندو اپنے مذہبی عقائد اور گیان حاصل کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ تزکیہ نفس کی اصلاح کے لیے مرشدِ کامل کی صحبت اختیار کر کے منازل کو طے کرنے کے عمل کو راہِ سلوک کہا جاتا

ہے۔ صوفی ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو معرفتِ حق کے کمالات کو ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعے حاصل کرتا ہے جبکہ مجذوب ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جسے معرفتِ حق نے اللہ کے ساتھ اس طرح وابستہ کر دیا ہو کہ اسے من جاب اللہ کسی ریاضت و مجاہدہ کے بغیر کمالات حاصل ہو جائیں۔ ریاضت و مجاہدہ کے لیے کسی ولی کامل یا مرشدِ کامل کی پیروی اختیار کی جاتی ہے۔ مرشدِ کامل طالب کو ریاضت میں رکھ کر اس کو اصل مقصود کی جانب راغب کرتا اور اس کی توجہ کو من جانب اللہ مبذول کرواتا ہے اس کے اندر حقیقی محبت کو اُجاگر کرتا ہے۔ مرشدِ کامل دنیا کی الفت و محبت کو سالک کے دل سے نکال باہر کرتا ہے اور اسے دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے، یہاں تک کہ اسے موت سے پہلے مرنے کی تربیت دیتا ہے یعنی خواہشاتِ نفسی اور وساوس شیطانی ختم کرنے کے لیے اسے ریاضت کے عمل سے گزارتا ہے۔ سالک کے دل سے "میَں" کو ختم کرتا ہے اور "الا اللہ" کا درس دیتا ہے۔ راہِ تصوف میں ریاضت سے زیادہ سخت امتحان کوئی نہیں ہے۔ چوں کہ مرشدِ کامل حقائق ربانی سے سرفراز ہوتا ہے اس لیے سالک کو اس عمل سے گزارتا ہے جس کے بارے میں طالب نہیں جانتا۔

انسان کو ہر دور میں اپنے خالق کی تلاش اور جستجو نے سرگرمِ سفر رکھا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر میں اس سفر کے لیے بہترین راستہ تصوف کے سائے میں معرفتِ الٰہی کا حصول ہے جو ذہنی الجھنوں سے چھٹکارے کا باعث بنتا ہے۔ رسولِ اکرم خاتم النبیین ﷺ کی ذات والا برکات کی زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ قرار دی گئی ہے۔ شریعت کے اصولوں پر صحیح معنوں میں زندگی گزارنے کے لیے ہمیں جس کسوٹی کی ضرورت ہے وہ اسوۂ رسولؐ ہے۔ صوفیا نے تصوف کی بنیاد ہی شریعت و طریقت کے اصولوں پر رکھی ہے۔ صوفیا اس بات پر مصر ہیں کہ راہ سلوک کے تمام مدارج کا ثبوت رسولِ اکرمؐ کی زندگی مبارکہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ وہ صفات کاملہ جو اللہ کی ذات نے رسول اکرمؐ کو عطا فرمائی تھیں، آپ کے تتبع میں عمل پیرا ہو کر صوفیا خود اپنی اصلاح کرتے ہیں اور محبانِ خدا اور رسولؐ کو بھی اس راہ پر لگاتے ہیں۔ صاحبِ طبقات الصوفیہ لکھتے ہیں:

> "حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے کی علامات میں سے ایک علامت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب حضرت محمدؐ کے اخلاق، افعال اور آپؐ کے حکم اور سنن میں اتباع و پیروی کرے۔" (۳)

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر اتباع رسولؐ کو اتباع خدا کہا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر تم فلاح و کامرانی چاہتے ہو تو نبی آخر الزماںؐ کی پیروی کرو۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونا ہی اصل زندگی ہے۔ شریعت کے احکامات پر عمل، طریقت کے راستوں پر چلنے سے ہی مل سکتا ہے۔ رسول اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ کامل و اکمل اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ حضور عالی مرتبت سرکارِ دو جہاںؐ نے اپنی زندگی مبارکہ میں جن امور پر عمل کیا یا جن احکامات کو کرنے کا حکم عطا فرمایا وہ سب امت کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اسوہ حسنہ دراصل اس بھلائی کی طرف دعوت نامہ ہے جو انسان کو حقیقی انسانی درجات پر پہنچا دیتی ہے۔ اخلاقِ حسنہ پر عمل کرنے سے انسان کے اندر تقویٰ جیسی صفت پیدا ہوتی ہے اور وہ خدا اسے محبت کرنے لگتا ہے۔ اتباعِ رسولؐ کو اپنی زندگی کے لیے مشعلِ راہ بنا لینے میں تمام تر بھلائی مُضمر ہے۔ حضرت بایزید بسطامی فرماتے ہیں:

> "میں نے کہا یا اللہ! میری ذات کے ہوتے ہوئے آپ سے ملنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا اور اپنی ذات سے ہم خود نہیں گزر سکتے۔ پھر میں کیا کروں؟ حکم ہوا کہ اے بایزید! تجھ سے تیری آزادی ہمارے محبوب حضرت محمدؐ کے اطاعت اور فرماں برداری سے وابستہ ہے۔ ان کے قدموں کی مٹی کو اپنی آنکھوں کے لئے سرمہ بنا لے۔" (۴)

دنیا کا کوئی پیغمبر یا شارح ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کے تمام تر پہلو ہماری آنکھوں کے سامنے اس طرح ظاہر ہوں کہ گویا اس کی زندگی ہمارے سامنے چلتی پھرتی تصویر کی صورت میں دکھائی دے۔ اس کی مثال معلم اعظم جناب محمد مصطفیٰؐ کی حیاتِ مبارکہ کے سوا کہیں نہیں مل سکتی۔ حضور اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ کے اَن گنت پہلو ہیں کہ زندگیاں ختم ہو سکتی ہیں مگر اوصافِ نبوت کو مکمل طور پر بیان کرنے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔ جہاں حضورؐ کی شجاعت بے مثل و بے مثال ہے، وہیں آپ کے مکارم اخلاق بھی سب سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔ اسلامی تاریخ کے دقیق مطالعہ سے ہم پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اکرمؐ کے اقوال و احوال دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ ایک کا تعلق امورِ محسوسہ سے ہے، جن میں قیام و قعود، رکوع و سجود، احکام و مناسک وغیرہ ہیں جب کہ دوسری قسم کا تعلق امورِ باطنیہ یا باطنی کیفیات سے ہے، ان میں وہ افعال شامل ہیں جو امورِ محسوسہ کے لیے نمایاں ہیں مثلاً اخلاص و ایثار، صبر و توکل، زہد و استغنا، خشوع و خضوع، رضائے الٰہی اور دیدارِ خدا۔ ان افعال کو سمجھنے کے لیے اس کی اہمیت ایسے ہی ہے جیسے انسانی جسم میں روح کی ہے۔ روح کی پاکیزگی قلب مطمئنہ کا سبب بنتی ہے۔ دل کی صفائی تزکیہ نفس اور مکارم اخلاق کے لیے کسوٹی کا کام کرتی ہے۔ اسی لیے رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ”خبر دار جان لو جسم کے اندر خون کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہے تو سارا جسم درست ہے اور وہ دل ہے۔“ امورِ باطنیہ یا تزکیہ نفس کے لیے تصوف کی اصطلاح اُردو ادب میں مستعمل ہے۔

تصوف ایک طرزِ زندگی ہے، ایک طریقہ حیات ہے، تھوڑا سا مختلف اور تھوڑا سا مشکل، مختلف اس لیے ہے کہ جستجو اور تلاش کا مرکز و محور جُدا ہوتا ہے اور مشکل اس لیے کہ یہ نفس کے خلاف جہاد کا نام ہے۔ صوفیا ظاہر سے زیادہ باطن کی اصلاح کی طرف توجہ دیتے ہیں اور دل کو پاکیزہ کرنے کی لگن میں مصروف رہتے ہیں تاکہ مشاہدہ حقیقی حاصل کر سکیں۔ صوفی کا کمال یہ ہے کہ وہ دنیاوی چیزوں سے رغبت نہیں رکھتا اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان سے منہ موڑے رکھتا ہے۔ تصوف ایسا طرزِ زندگی ہے جس میں سالک اپنے نفس پر قابو حاصل کرتا ہے اور راہ تصوف کی منازل کو عبور کرتا ہوا راہِ بقائے عدم کی جانب اپنا روحانی سفر جاری رکھتا ہے۔ وہ اپنی تمام خواہشات کو مالکِ حقیقی کے لیے ترک کر دیتا ہے اور اس کی رضا میں راضی رہنے کی سعی کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ قلبی صفا سے گزرتا ہے۔ قلب کی صفائی کے لیے جس قدر اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اخلاقی اوصاف کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی لیے صوفیا نے اخلاقی اوصاف کو تعلیماتِ تصوف میں بنیادی کلید کہا ہے۔ تصوف بندے اور خدا کے درمیان ایک حجابی کیفیت کا نام ہے جب کہ اخلاقی وصف بندے اور مخلوق کے درمیان براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ انسانوں سے محبت کرنے والا شخص خدا سے محبت کا دعوی تو کر سکتا ہے لیکن کوئی ایسا شخص جو مخلوق سے محبت نہ رکھے خدا سے محبت کا دعویٰ کرے تو وہ عبث ہے۔ سالک جب منزل تک پہنچ کر عارف ہو جاتا ہے تو اسے خدا کی رحمتیں اپنے دامن میں ڈھانپ لیتی ہیں۔ وہ حضوری کے اس مقام پر فائز ہو جاتا ہے کہ بندہ، بندہ ہونے کے باوجود خدائی صفات کا حامل ہو جاتا ہے۔ وہ اس دنیا میں خدا کو یاد کرتا ہے جب کہ اس کا تذکرہ ملائکہ کی جماعت میں ہو رہا ہوتا ہے۔ قرآن اس بات کو ﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۵۲] کے ذکر سے تخاطب کرتا ہے۔ سالک خدا سے محبت کرتا ہے جب کہ مخلوق اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ عالمِ قدس اس سے محبت کرتا ہے تو عالمِ دنیا کے دلوں میں اس کی محبت عام کر دی جاتی ہے۔ یہ وہ مقام محبوبیت ہے کہ بندہ محبوب حقیقی کا تابع ہو جاتا ہے۔ پانیوں میں رہنے والی مچھلیاں، جنگلوں میں رہنے والے درندے، پیڑوں پر بسیرا کرنے والے پرندے یہاں تک کہ تمام ذی روح اس سے محبت

کرنے لگتی ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ المائدہ میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾[المائدہ: ۱۳] صوفیا کو اپنے نفس پر عبور اور قابو حاصل ہوتا ہے۔ اسی کاملیت کی بنا پر بہت سے لوگ یہاں تک کہ عالم و دانشور بھی ان سے محبت اور انس رکھتے اور ان کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔

جگر لخت لخت از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ۱۵ /اگست ۱۹۲۴ء کو بٹالہ (ضلع گورداس پور پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میاں محمد الدین اور دادا کا نام میاں بھاگ محمد تھا۔ اُن کی ابتدائی زندگی اس معاشرتی تنوع میں گزری جس میں برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کا دلخراش واقعہ رونما ہوا۔ انھوں نے اپنے بچپن سے جوانی تک کے زمانے کو سیاسی رنگت سے آمیزش دی۔ حالات کی ستم ظرفی کی بدولت اپنی تعلیم میٹرک سے آگے مکمل نہ کر سکے تھے کہ تلاشِ معاش میں آل انڈیا ریلوے میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستان مسلم لیگ میں فعال رکن کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ مسلم نیشنل گارڈز میں بطور ناظم یوم آزادی تک اہم کردار ادا کیا مزید برآں بٹالہ میں مسلم نیشنل گارڈز کی تنظیم کے سربراہ بھی رہے۔

وہ آزادیِ پاکستان کے چشم دید گواہ اور حالات و واقعات کے عینی شاہد تھے۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور آئے اور یہیں اپنے تعلیمی تعطل کو از سرِ نو شروع کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں نمایاں کامیابی کے ساتھ مکمل کیں اور پنجاب یونیورسٹی میں ہی بطور لیکچرار ۱۹۵۹ء میں اپنے تدریسی سفر کا آغاز کیا۔ وہ ۱۹۷۰ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہو گئے پھر پروفیسر کے عہدے تک ترقی کی اور اگست ۱۹۸۴ء میں ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد استنبول یونی ورسٹی سے منسلک ہوئے جہاں عربی، فارسی اور اُردو کے شعبہ جات کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

وہ کثیر کتب کے مصنف رہے ہیں۔ اُنھوں نے اُردو اور انگریزی زبان میں متعدد کتب تصنیف و تالیف کیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: تاریخ یونیورسٹی اور نیٹل کالج لاہور۔ خیالاتِ آزاد (نواب سیّد محمد) مع مقدمہ۔ مضامین سرسید: انتخاب مع مقدمہ۔ ظفر علی خاں: ادیب و شاعر۔ اکبر و اقبال۔ اقبال کا ذہنی و فکری ارتقا۔ صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب۔ قومی زبان کی تلاش۔ قومی زبان کی بازیافت۔ گاندھی: لسان العصر کی نظر میں۔ جدوجہد آزادی میں پنجاب کا کردار۔ تحریک ہجرت پس منظر و پیش منظر۔ افغانستان اور اقبال۔ بزم اکبر سے بزم اقبال تک۔ مردم دیدہ و شنیدہ۔

Development of Iqbal's Mind and Thought-
Pakistan: As Visualized by Iqbal & Jinnah.

اس کے علاوہ اُن کی آپ بیتی بہ عنوان "جگر لخت لخت" ہے۔ اس مضمون میں تعلیماتِ تصوف کی بنیادی کلید کے تناظر میں اس آپ بیتی میں موجود صوفیانہ رنگ کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا انتقال ۱۳ جون ۲۰۰۷ء کو لاہور میں ۸۲ سال کی عمر میں ہوا اور پنجاب یونی ورسٹی قائد اعظم کیمپس (اساتذہ کے قبرستان) میں خاک نشین ہیں۔ راقم کو پروفیسر صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی نے ایک انٹرویو بتاریخ ۱۳ /اکتوبر ۲۰۲۴ء کو بتایا کہ ڈاکٹر غلام حسین کی صحت اُن کی زندگی کے آخری لمحات تک بالکل ٹھیک تھی۔ سہ پہر کے وقت اکٹھے (باپ بیٹی نے) کھانا کھانے کے بعد دفتری امور پر کچھ بات چیت کی پھر ڈاکٹر صاحب نے نماز عصر ادا کی اور نماز کے فوری بعد حرکت قلب بند ہو جانے پر ان کا وصال ہو گیا۔ آہ! کیسی توانا زندگی اور کس قدر خاموش

موت ــــــ اُن کے وصال پر یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ ”عالِم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے“۔ اسی انٹرویو میں راقم نے سوال کیا کہ کیا ڈاکٹر صاحب کو کوئی سرکاری ایوارڈ ملا؟ تو ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا کہ ارباب نے ان کی کتاب ایوارڈ کے لیے نامزد تو کی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا کہ ” ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے شخصیت کا بڑا ہونا ضروری ہے اور میں خود کو ابھی اتنا بڑا نہیں سمجھتا۔“ یہ جملہ ڈاکٹر صاحب کے صوفی منش ہونے پر کس قدر صادق اور ان کی عاجز مزاجی کا آئینہ دار ہے۔ (ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی ان دنوں منہاج یونیورسٹی لاہور میں تشنگانِ علم و ادب کی سیر ابی کے لیے جلوہ افروز ہیں)۔ بات دراصل یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کی شخصیت میں ایک ایسا درویش چھپا بیٹھا تھا جو شریعت کے اس حکم کے عین مطابق تھا جو دنیا اور دنیا کی تمام تر آسائشوں سے بے نیاز رہتے ہوئے خالقِ حقیقی کے ساتھ اپنا تعلق نبھاتا رہتا ہے۔ وہ لوگوں کے طعن و تشنع کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ کوئی کیسا ہی جملہ اس کے لیے بول دے، کوئی کیسی ہی تکلیف بھری بات کہہ دے، درویش کا کام اس کو برداشت کرنا اور اس پر صبر کرنا ہوتا ہے۔ درویش اتنی جلدی بے نقاب نہیں ہوتا کہ ہر انسان آسانی سے اس کے محاسن کو سمجھ لے، وہ بے نقاب ہونے کے بعد بھی اپنے اوصاف و محاسن اور تاب و توانائی کو اپنے طالب کے ظرف و ضمیر سے زیادہ بے نقاب نہیں کرتا اور نہ اوٹ پٹانگ دعویٰ کرتا ہے۔ درویش کی سادہ پہچان یہی ہے کہ وہ خود بھی پُر سکون ہوتا ہے اور اس کی مجلس بھی پُر سکون ہوتی ہے۔ یہی اصلیتِ درویش ہے۔ علم کلام کے ماہر ولی کی تعریف میں بتاتے ہیں کہ ولی ایسا شخص ہے جو صحیح العقیدہ ہو اور شریعت کے مطابق نیک اعمال بجالاتا ہو۔ اس کے پیشِ نظر ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہتا ہو۔ اولیا اللہ کو چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کسی اور چیز کی طلب نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ وہ ہر وقت اللہ کی رضا کے طلب گار ہوتے ہیں۔ یہ بندگانِ خدا اللہ کے لیے مست ہوتے ہیں اور اسی کی آرزو اور طلب میں جیتے ہیں۔ جو لوگ اللہ سے لو لگانا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ ایسے لوگوں سے تعلق پیدا کریں جو دنیاوی خواہشات میں بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ نے قرآن میں بشارت دی ہے کہ وہ بے خوف ہیں انھیں کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے اور ایسے ہی لوگوں کے ساتھ اللہ نے جُڑ جانے کا حکم دیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی شخصیت میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں مگر ظاہراً اُنھوں نے ایسی سادگی کو اپنا رکھا تھا کہ عام آدمی سے یہ خوبیاں چھپی ہوئی تھیں۔ ”جگرِ لخت لخت“ پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی آپ بیتی ہے جسے انھوں نے پانچ مندرجات میں تقسیم کیا ہے:

پہلا حصہ بہ عنوان:	ابتدائی حالات
دوسرا حصہ بہ عنوان:	رُودادِ چمن (جدوجہد آزادی کا مرحلہ)
تیسرا حصہ بہ عنوان:	رُودادِ چمن (آزادی کی منزل)
چوتھا حصہ بہ عنوان:	مقاصد کی نئی جہت
پانچواں حصہ بہ عنوان:	سفر و سیاحت

آپ بیتی کا اختتامیہ الگ سے موجود ہے۔ آپ بیتی ۳۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ذیل میں پروفیسر صاحب کی آپ بیتی سے اُن کی صوفیانہ حالاتِ زندگی کے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی ادنیٰ کوشش کی گئی ہے۔

صوفیا کی نظر میں سب سے مقدم اسوہ رسولؐ ہوتا ہے اور حضورؐ کے پیروکاروں کا ہر رخ اصلاحی ہوتا ہے۔ وہ دنیاوی بلندیوں اور طمع سے بے نیاز ہو کر اقوام عالم کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اور جو رسولؐ کی سنت کو زندہ کرتا ہے اللہ

اسے حیات دوام عطا کرتا ہے۔ اولیاء اللہ حضورؐ کی محبت و الفت میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ آپؐ کی ہر سنت اور ہر ادا پر دل و جان سے فریفتہ ہوتے ہیں اور اس سنت کو ہر حال میں ادا کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ جس جگہ پر ان کے محبوب حقیقی (حضورؐ) نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی گزارا، اس مقام کی برکت حاصل کرتے اور اس کی زیارت کو اپنے لیے باعث شرف سمجھتے ہیں۔ اولیا اور اہلِ صوف ان مقامات سے روحانی سکون حاصل کرتے ہیں اور محسوسات کے عالم میں پرواز کرتے ہیں۔

قربتِ الٰہی کے حصول، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اولیائے کاملین کی قبور کی زیارت کے لیے جانا جائز اور سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ خود امام الانبیا ﷺ شہدائے احد کے مزار پر تشریف لے جاتے۔ جامع ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> "میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا تو اب محمدؐ کو اجازت دے دی گئی ہے، اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی، لہٰذا تم بھی قبروں کی زیارت کرو بے شک وہ آخرت کی یاد دلاتی ہے۔"(۵)

روحانی فیوض کی برکات حاصل کرنے کے لیے مزاراتِ اولیا پر جانا، ان کی زیارت کرنا اور ان سے برکات حاصل کرنے کی شریعت میں اجازت تو ہے مگر تعظیم و ادب کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ جمہور مسلمانوں کا مزاراتِ اولیا پر حاضری دینے اور ان سے مراد مانگنے کا طریقہ نہایت معقول اور احتیاط کا آئینہ دار ہے۔ قاضی الحاجات اور ہر مشکل کشا تو اللہ کی ذات ہے لیکن مقربین بارگاہِ ایزدی کے توسل سے مانگی ہوئی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ صحیح معنوں میں بزرگانِ دین کی بارگاہ میں پیش ہونا اور مزارات پر دعا مانگنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ صاحبِ مراد اللہ کے حضور صدقِ دل سے دعا کی قبولیت کا طالب ہو اور وسیلہ کے طور پر بزرگانِ دین کے توسل سے دعا کرے تاکہ قبولیت کا درجہ اعلیٰ ہو سکے۔ اس نیت سے اولیا کے مزارات پر جانا، وہاں مراقبہ کرنا، ان کے فیوض سے برکات حاصل کرنا جائز اور ائمہ مجتہدین سے ثابت شدہ عمل ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین اپنی آپ بیتی میں بیان کرتے ہیں کہ اولیا اللہ کا قرب انسان کی دلی قویٰ اور تسکین کو بڑھا دیتا ہے۔ اولیا کے روحانی فیوض و برکات کا پھیلاؤ دور دور تک ہوتا ہے اور ان کے متعقدین ان فیوض و برکات سے قلبی سکون حاصل کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میَں جب بچپن میں پہلی مرتبہ اپنے ابو جان کے ساتھ لاہور کی سیر کے لیے آیا تو داتا علی ہجویریؒ اور حضرت میاں میرؒ کے مزاراتِ پُرانوار پر بھی حاضر ہوا۔ میرے والد بریلوی مسلک سے اُنس رکھتے تھے اور کئی ایک رسومات بھی ادا کرتے تھے، جن سے مجھے عقیدت نہ تھی۔ وہ رقم طراز ہیں:

> "لاہور اولیائے کرام کا بھی مسکن رہا ہے۔ اس شہر کے اندر اور باہر سیکڑوں اولیائے کرام آسودہ خاک ہیں۔ اس سیاحت کے دوران ہم حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت میاں میرؒ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر بھی جاتے رہتے تھے۔ یہاں پہنچ کر یوں محسوس ہوتا جیسے یہاں محبت و شفقت کے چشمے پھوٹ رہے ہوں اور ہر کوئی اپنے ذوق کے مطابق سیراب ہو کر جا رہا ہو۔ والد صاحب اور کئی دوسرے لوگوں کو یہاں قبروں کو بوسہ دیتے اور تعظیمی سجدہ کرتے دیکھا۔ میں صرف فاتحہ پڑھ کر اور مغفرت کی دعا مانگ کر باہر آجاتا۔ میرا معصوم ذہن بوسے اور سجدے سے، خواہ وہ تعظیمی ہی کیوں نہ ہو، مانوس نہ ہو سکا۔"(۶)

ایسی ہی بزرگانہ عقیدت و محبت کی ایک داستان انھوں نے اپنی آپ بیتی کے آخری باب، جس میں انھوں نے اپنے روحانی سفروں کا تذکرہ کیا ہے، میں بھی کیا ہے جب وہ ترکی کے مشہور شہر قونیا میں امام العاشقاں حضرت امام جلال الدین رومیؒ کے

مزار کی زیارت کے لیے قونیا گئے تھے۔ ان کے فیوض اور روحانی برکات کا عالم یہ ہے کہ پورے قونیا شہر میں اس کے اثرات کو محسوس کیا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر دلوں کی آسودگی دور ہوتی ہے اور قلب انہماک کے ساتھ روحانی کیفیت کو محسوس کرتا ہے۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

"۔۔۔فوراً بعد مولانا کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ سبز مخروطی گنبد دُور سے نظر آیا۔ از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ درود و سلام پڑھتے ہوئے زیارت گاہ میں داخل ہوئے تو عجیب روحانی کیف کا عالم تھا۔۔۔ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے باطن کی آلودگیاں صاف ہو رہی ہوں اور ان کی جگہ لطافت لے رہی ہو۔۔۔عقیدت، محبت اور محویت کا عجیب عالم تھا۔ مولاناؒ کا فیضِ عام جاری تھا۔"(۷)

مولانا جلال الدین رومیؒ قونیا میں آرام فرما ہیں۔ اُن کے فیوض سے پورے قونیا شہر کی فضا میں ایک روحانی کیفیت اور اعصاب پُر اثر پذیر ہونے والی کیفیت کو محسوس کیا جاتا ہے۔ یہ بات انھوں نے صرف اپنے زورِ مشاہدہ سے نہیں کہی بلکہ کئی غیر ملکی مندوبین بھی اس کیفیت سے دوچار ہوئے۔ پروفیسر صاحب اپنے سفر کی روداد لکھتے ہوئے بتاتے ہیں:

"ڈاکٹر ایرکان بے نے بتایا کہ یہاں آکر بعض امریکی، جرمن اور فرانسیسی سیاحوں نے بھی استفسار کیا کہ قونیا کی فضا میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ جب وہ اس سفر پر روانہ ہوئے تھے تو ان کے اعصاب اضطراب و انتشار میں مبتلا تھے اور جونہی قونیا کی فضا میں پہنچے تو یہ سب اضطراب اور انتشار سکون و اطمینان میں بدل گیا۔ جب انھیں یہ بتایا گیا کہ یہاں مولانا جلال الدین رومیؒ کا روحانی فیض جاری و ساری ہے تو انھیں بہت حیرت ہوئی اور اعتراف کرنا پڑا کہ واقعی یہ بات درست ہے کہ انھیں یہاں پہنچ کر ایک روحانی مسرت و راحت کا احساس ہو رہا ہے۔"(۸)

اللہ کے ولی کی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان میں پختہ ہوتے ہیں اور انھیں خدا کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ وہ دُنیاداروں اور دنیا کے موجودات سے ہرگز ہراساں نہیں ہوتے بلکہ دنیاوی واقعات ان کے ایمان کو تقویت دیتے ہیں کہ قرآن اس بات پر شاہد ہے ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾[یونس:۶۲] اسی ارشاد کے بہ موجب اللہ کے دوست دنیا میں سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتے۔ اپنے ایمان کی پختگی اور موت سے بے خوفی کا منظر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی آپ بیتی میں جابجا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے لڑکپن کا حال بیان کرتے ہوئے ایسے ہی ایک واقعے کی روداد بیان کرتے ہیں:

"قدم آگے بڑھاؤں یا نہ بڑھاؤں؟ اس تاریکی میں جہاں میں کھڑا ہوں اور اس سیاہی میں جو دو فٹ کے فاصلے پر ہے، یہ فرق کیوں ہے؟۔۔۔جب میں سیاہ لکیر والے مقامِ خطر پر پہنچا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ دراصل یہ ایک گہرا ویران کنواں تھا جس کی منڈھیر کا نشان بھی مٹ چکا تھا اور یہ جگہ زمین کے برابر ہو چکی تھی گویا رات میرے اور موت کے درمیان صرف دو فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔۔۔اس واقعے نہ مجھے زندگی اور مت کے سنگم پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس واقعے نہ میرے ایمان میں پختگی پیدا کی اور موت کا خوف دل سے جاتا رہا۔"(۹)

راہِ تصوف میں صوفی ہمیشہ عجز و انکساری کے دامن کو اپنے ہاتھ میں لیے اس راہ کو عبور کرتا ہے جہاں اس کے دل میں اس بات کا شائبہ ہوا کہ اس نے کچھ حاصل کر لیا ہے وہیں تکبر کی وجہ سے سب کچھ اس سے چھین لیا جاتا ہے اور وہ اس راہ پر

منزلِ مقصود حاصل کرنے کے لیے بھٹکتا رہتا ہے۔ عاجزی وانکساری اور خود فراموشی کی لذت اسے اس راہ پر مشعل راہ بنائی ہوتی ہے۔ عاجزی کا علم تو یہی ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کے نام کو اور اس کے ذکر کو جپتا رہے۔ یہی اس کی لذتِ نفسی اور لذتِ روحانی کے لیے کافی چیز ہے۔

بے شک شرک سب سے بڑا گناہ ہے ہ اور اس گناہ کے مرتکب افراد سے رسم و راہ نہیں نبھائی جا سکتی۔ اسلامی تعلیمات اگرچہ بین المذاہب کا درس دیتی ہیں پھر بھی مشرکوں کے ساتھ دوستی اور رشتہ داری کی ممانعت کرتی ہیں۔ بزرگانِ دینِ اسلام کے ان شعار کو مشعلِ راہ سمجھتے ہوئے اپنے شب وروز گزارتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین اپنی آپ بیتی میں بھی اپنے دوستوں اور ہم جماعت ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے اسی طرح کی گفت گو فرماتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اگرچہ ان کے دوستوں اور ہم جماعتوں کی فہرست میں ہر مذہب کے ماننے والے موجود ہیں تاہم ہندو دوستوں سے میل جول رکھنے میں اجتناب برتتے کیوں کہ وہ توحید پرست نہیں ہیں اور ان کے جسم سے بدبُو آتی ہے۔ (یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہندوازم میں بھی ایک طبقہ موحدوں کا ہے)۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”رام داس کا بیٹا امرناتھ بھی میرا ہم جماعت تھا۔ ڈیسک پر میرے ساتھ بیٹھا کرتا مگر میں اس کے جسم نے نکلنے والی بُو سے اکثر پریشان ہو کر پوچھا کرتا کہ تم روز صبح اشنان کر کے آتے ہو، پھر یہ تمہارے وجود میں بُو کیسی؟ وہ کچھ خفیف ہوتا مگر وجہ کیا بتاتا [اتفاق سے چند سال پہلے استانبول میں قیام کے دوران یہی سوال ایک تُرک دانشور نے ہندوؤں کے بارے میں مجھ سے پوچھا۔۔۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ غالباً یہ بدبُو ”شرک“ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام میں مشرک سے ارتباط واختلاط کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے]۔۔۔ ان سکھ دوستوں کے پاس بیٹھنے سے ایسی بُو کا کوئی احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس لیے کہ سکھ بہر حال توحید پرست ہیں، مشرک نہیں۔ یہی بات عیسائی دوستوں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔“(۱۰)

اولیا کاملین ہر معاملے میں اللہ کی ذات پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہیں۔ یہی راہِ سلوک کی اصل ہے کہ خود کو اور اپنے ہر کام کو امرِ ربی کے سپرد کر دینا۔ رضائے الٰہی پر کاربند رہنا اولیا کے خصائص میں شامل ہوتا ہے۔ وہ ہر بات اور ہر کام میں مشیتِ ایزدی کے پابند ہوتے ہیں۔ وہ دنیاوی لالچ اور حرص سے آزاد ہوتے ہیں اور ہر قسم کی اخلاقی برائیوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔ وہ دنیاوی جاہ و مرتبت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اسے عارضی سمجھتے ہوئے کسی کے آگے حصولِ منصب کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ وہ ہر معاملے کو خدا کے سپرد کرتے ہیں اور اسی سے مدد مانگتے ہیں۔

صوفیانہ تعلیمات میں جہاں نفس کی پیروی کی ممانعت ہے وہیں اپنے آپ میں اور اپنی زندگی کے امور میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کی اہمیت مسلّم ہے بل کہ صوفیانہ منہاج میں بنیادی عنصر کے طور پر عمل پیرا ہونے کی چیز ہے۔ اللہ کی راہ پر چلنے والے سپاہی کی زادِ راہ توکل الی اللہ کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ کی ذات پر بھروسہ اور توکل صوفی کو معراج کی اُس سطح تک لے جاتی ہے جہاں انسان میں خدائی صفت ”بے نیازی“ کا جلوہ ظاہر ہوتا ہے اور وہ مخلوق سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے اور اس کا حکم بجالاتا ہوا ہر حالت میں راضی برضا رہتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا انداز ملاحظہ کیجیے:

"اچانک ویرانے میں ایسا مرغن کھانا مل گیا جو شہر میں بھی کم نصیب ہوتا ہوگا۔ سب کو خدا کا فضل و کرم یاد آ گیا۔ بنی اسرائیل کو بھی تو اسی طرح ویرانے میں من و سلویٰ مل گیا تھا مگر وہ ناشکرے ہو گئے تھے مگر مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ ہر حالت میں راضی برضا رہتے ہیں۔"(۱۱)

حضرت آدم علیہ السلام کو مسجودِ ملائک ٹھہرایا گیا۔ ان کو یہ اعزاز فقط اس لیے ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جسم میں اپنی روح پھونکی۔ شیطان کو حکم ملا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو اس نے جس بنیاد پر انکار کیا وہ آدمؑ کا روح اللہ ہونا نہ تھا بلکہ ابلیس نے مادیت کو منتہائے مقصود ٹھہراتے ہوئے انکار کیا۔ اس کا خدا کے حکمِ سجدہ پر جواب یہی تھا کہ میں اس (آدمؑ) کو سجدہ کیوں کر کروں کہ اس کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے جب کہ میری آگ سے ہے۔ اس کی نظر میں مادیت کا پہلو عیاں جبکہ روحانیت کا پہلو نہاں رہا۔ اسی مادیت کو ابلیس نے اعلیٰ سمجھا۔ حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد کو اللہ نے بیک وقت مادیت اور روحانیت دونوں خاصیتیں عطا فرما کر دنیا میں بھیجا مگر دنیاداروں اور شیطان کے پیروکاروں نے مادیت کو زیرِ بحث لا کر روحانیت سے انکار کرنے کی سعی کی۔ یوں ابلیسی سوچ اور فکر کے ایک ٹولے نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کیوں کہ یہ وہ گروہ ہے جن کا معیارِ عقل کم ہے اور وہ روحانیت کو سمجھنے والے اذہان سے قاصر ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ روحانیت کی دنیا کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ روحانیت میں ایسے مافوق الفطرت اور ماورائی واقعات اور حوادث رونما ہو جاتے ہیں کہ انسانی عقل دھنگ رہ جاتی ہے۔ صوفی ازم میں ان واقعات اور حوادث کو کراماتِ اولیا سے تعبیر کیا جاتا ہے جب کہ انبیاؑ اور رسل سے وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ جس طرح معجزات سے انکار جائز نہیں اسی طرح کراماتِ اولیا سے انکار بھی جائز نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کرامات کا ظہور ان لوگوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا جو روحانیت کے قائل نہیں یا جو روحانیت کے تصور سے اپنے ذہن کو جدا سمجھتے ہیں کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت استعداد عقلی ہونے کے بجائے جسمانی ہوتی ہے۔ وہ ہر کائنات کی ہر چیز کو مادیت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔

انسانی عقل اور فہم ابھی اس انتہا کو نہیں پہنچ پائی کہ وہ مادی دنیا سے ماوراعالم کو تجسیم کی صورت میں بیان کر سکے۔ یہ کشف و کرامات کی دنیا بزرگانِ دین اور صوفیا کے مشاہدہ میں ہوتی ہے اور وہ ان کرامات کے شاہد ہوتے ہوئے عالم سکر میں مناسب الفاظ و تراکیب کی مدد سے ان کو بیان کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ یہ روحانی عالم عامی کے لیے ہرگز نہیں اسی بنا پر صوفیا اپنی کیفیات کو دنیاداروں سے مخفی رکھتے ہیں اور اپنے حال کو مجلسوں میں بیان نہیں کرتے۔ اسی سبب سے حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت شبلیؒ کو صوفیا کے اسرار و رموز عوام کے سامنے بیان کرنے سے منع کیا تھا۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے مظاہر دو رُخوں میں نظر آتے ہیں۔ اولاً مادی اور دوسرا باطنی۔ مادی کائنات کا مظہر تو وہ سب کچھ ہے جو انسان کو ظاہری آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے جب کہ باطنی مظاہر کا تعلق انسان کے باطن یا روحانیت سے ہے۔ دیکھتی اسے بھی انسانی آنکھ ہی ہے لیکن اس انسانی آنکھ کی بینائی کا انحصار اللہ کے نور سے ہے۔ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اتَّقُوا فِرَاسَةَ المؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّه (سنن ترمذی، حدیث نمبر ۳۱۲۸) یہ اللہ کا نور ہی انسان کے ظاہر اور باطن دونوں مشاہدات کا مظہر ہے۔ جب کوئی اہلِ دل یا صوفی اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات اور کیفیات کو اپنی روحانیت سے اپنے دل پر محسوس کرتا ہے تو ایسے مشاہدے کو تصوف کی اصطلاح میں وارداتِ قلبی کہا جاتا ہے۔ انسان کے دل پر گزرنے والی روحانی کیفیت کا نام وارداتِ قلبی ہے۔ روحانیت میں وارداتِ قلبی ہر سالک کا ذاتی مشاہدہ

ہوتا ہے۔ اسے تشہیر نہیں کیا جاسکتا اور اگر کوئی اس کی تشہیر کرتا ہے تو عام لوگوں کی سمجھ سے بالا تر محسوس ہوتے ہیں۔ صوفیا کا شعار یہی ہے اور وہ اپنے سالکوں کو تصوف میں یہی درس دیتے ہیں کہ مشاہداتِ حق کے جلوؤں کو دوسروں پر آشکار نہ کیا جائے اور جو وارداتِ قلب اسے حاصل ہوں اس سے لطف اندوز ہوں اگر یہ مشاہدات عامی پر آشکار کر دیئے جائیں تو بعض اوقات لوگ ان کو مجنون تصور کرتے ہیں یا پھر وہ اتنی سمجھ نہ رکھنے کے باعث خود گمراہ ہو جاتے ہیں۔ روحانی فیوض و برکات کی ایک مثال یہ ہے کہ وہ اپنی رودادِ زندگی کو بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ میں جب استنبول پہنچا تو مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے میں مولانا رومیؒ کے روحانی فیض اور نگاہ نے پردیس میں میرے لیے سبب بنا دیا۔ یہ واقعہ ڈاکٹر اور حان بے اور مصنف کے درمیان مکالمے کی صورت میں پیش آیا:

> "۔۔۔کہنے لگا: "ہاں، مجھے تو پروفیسر نہاد چیتن نے بھی یہ ہدایت کی ہے کہ آپ کے ساتھ رہوں اور آپ کے آرام کا خیال رکھوں"۔ میں نے کہا: "یہ سب کچھ مولانا رومؒ کے ایما پر ہو رہا ہے۔ مولاناؒ کو پتہ تھا کہ اُن کا ایک عقیدت مند لاہور سے چلا ہے اور استنبول پہنچ رہا ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ یہ روحانی عالم کی باتیں ہیں، عقل و فہم میں نہیں آسکتیں۔"(۱۲)

صوفی کی تربیت اسی طَرق پر ہوتی ہے کہ وہ لوگوں سے محبت و الفت کو اپنا معیار سمجھے۔ وہ انسانوں کے اندر خدا کی محبت کو داخل کرے اور ان کے قلوب سے بُری اور شیطانی عادات کو ختم کرے۔ اس طرح ہر صوفی اسی کاوش میں رہتا ہے کہ انسانوں کے دل یادِ الٰہی سے منور ہوں اور ان میں شیطانی اطوار جنم نہ لیں۔ جھوٹ، غیبت، چغلی اور اس قسم کی دیگر اخلاقی برائیوں سے نفوس خدا کو بچانا ہی صوفی کی معراج ہے۔ وہ ہمیشہ مخلوق خدا کی بھلائی کا حیلہ کرتا ہے۔ صوفی مخلوق خدا پر زبردستی نہیں کرتا بلکہ محبت بھرا انداز اختیار کرتا ہے۔ درویش کا مقصدِ حیات محبت کو اپنانا، محبت کا پرچار کرنا، محبت کو پھیلانا اور محبت کو بانٹنا ہوتا ہے۔ وہ مخلوق خدا کا خیر خواہ ہوتا ہے اور ظلم و زیادتی کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ اخلاقی برائیوں سے خود بھی اجتناب کرتا ہے اور اپنے معتقدین کو بھی ان اخلاقی برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور سالک کی تربیت کرتا ہوا اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں ہر قسم کی اخلاقی برائیاں اس سے دور ہو جاتی ہیں اور وہ ان اخلاقی آلائشوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ وہ ظلم و بربریت کو پسند نہیں کرتا۔ جرم و سزا کا کوئی تصور درویش کی لغت میں موجود نہیں ہوتا۔ وہ بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل سب انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ ولیوں اور درویشوں کے منصب کا مقصد ہی مخلوق خدا کو جوڑنا اور ان میں باہم الفت و محبت کو پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ وہ مخلوق خدا کی دست گیری کرتے ہیں اور انھیں محبوبِ حقیقی سے آشنا کرتے ہوئے ان کا تعلق ازلی محبوب سے جوڑتے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو معلم بھی درویشوں کی صف میں موجود نظر آتے ہیں کہ ان کا کام بھی مخلوق خدا کے مابین محبت و الفت کا رشتہ استوار کرنا اور ان کے مسائل کی دست گیری کرنا ہے۔ جملہ معروضات اور جگرِ لخت لخت کے دقیق مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی شخصیت اپنی ذات میں ایک درویش منش حیثیت کی حامل تھی جن کا کام مخلوقِ خدا سے محبت کرنا اور ان کی بھلائی کے لیے ہمہ وقت مصروف رہنا تھا۔ وہ اپنے آخری وقت تک اپنے فرائض کی ادائی اور درس و تدریس کے شعبے سے منسلک رہے، یہاں تک کہ انھوں نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ خدا اُن کی قبر پر کروڑوں رحمتوں کا نزول فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

حوالے

۱۔ امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری،''الرسالۃ القشیریہ'' ،مترجم : محمد صدیق ہزاروی، باب المحبۃ،(لاہور، مکتبہ اعلیٰ حضرت)،ص ۳۵۴

۲۔ ایضاً:ص ٦۹

۳۔ ابی عبد الرحمٰن محمد بن الحسین السلمیٰ،''طبقات الصوفیہ''، مترجم:شاہ محمد چشتی،(ادارہ پیغام القرآن،لاہور،۲۰۱۱ء)،ص ۳۵

۴۔ محمد ذیشان،''ہر دل آئینہ ہے''، مشمولہ:ماہنامہ قلندر شعور،(کراچی، عظیمی یونیورسٹی پریس،ج۴،ش ۲،مارچ۲۰۱٦ء)،ص۲۵

۵۔ عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ،''الجامع الصحیح وھو سنن الترمذی''،(القاہرہ،مطبعہ مصطفی البانی الحلبی واولادہ)،ج۲،ص ۳۳۰،حدیث ص 1052

٦۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین،''جگرِ لخت لخت''،(لاہور، مکتبہ خیابان ادب،۲۰۰۵ء)،ص۲۷

۷۔ ایضاً،ص ۳٦۰

۸۔ ایضاً،ص ۳٦۵۔۳٦٦

۹۔ ایضاً،ص ۳۳

۱۰۔ ایضاً،ص ۵۷۔۵۸

۱۱۔ ایضاً،ص ۱۹۴

۱۲۔ ایضاً،ص ۳۵۹

References

1- Imam Abdul- Qasim Abdul- Karim bin Hawazin Al-Qushairi, "Al- Risalat Al-Qushairiyyah", translated by Muhammad Siddiq Hazarvi, Bab Al-Majjat, (Lahore, Makataba Ala Hazrat), 354
2- ibid, 69
3- Abi Abdur Rahman Muhammad bin Al-Hussein Al- Salmi, "Tabqat Al- Sufiyyah", translated by Shah Muhammad Chishti, (Lahore, Idara Paigham-ul-Quran, 2011), 35
4- Muhammad Zeeshan, "Every Heart is a Mirror," included in: Monthly Qalandar Shu'or, (Karachi, Azimi University Press, Vol. 4, Issue 2, March 2016), 25
5- Isa Muhammad ibn Isa ibn Surah, "Al-Jami' al-Sahih wahu Sunan al-Tirmidhi", (Cairo, Mustafa al-Albani al-Halabi and his sons' press, vol. 2), 330, hadith 1052
6- Ghulam Hussain Zulfiqar, Professor, "Jagar-e-Lakht-Lakht", (Lahore, Maktaba Khayaban Adab, 2005), 27
7- ibid, 360
8- ibid, 365-366
9- ibid, 33
10- ibid, 57-58
11- ibid, 194
12- ibid, 359

❖❖❖